ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید اور عصری شعور

محمد امجد عابد*
عاشق حسین**

Abstract:

"Dr. Saleem Akhtar is a renowned critic of Urdu. He is usually known as psychological critic but psycho analysis is merely one aspect of his criticism. Being a progressive he has also had a deep relation with society. He, in his criticism, has given the proof of contemporary awareness in light of contemporary situation along with social awareness. In the essay given, his use of contemporary conciousness is indicated.

ڈاکٹر سلیم اختر اُردو کے ایک اہم نقاد کے طور پر معروف ہیں۔ وہ ۱۱ مارچ ۱۹۳۴ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے زمانہ طالب علمی میں فلسفے کو ایک مضمون کے طور پر اختیار کیا۔ فلسفے سے نفسیات کی طرف آئے اور نفسیات میں اتنی دل چسپی پیدا ہوئی کہ پھر اسی کے ہو رہے اور آج وہ ایک اہم ترین نفسیاتی نقاد کی حیثیت اختیار آ چکے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے فن پارے یا تخلیق کی اتھاہ تک اترنے کے لیے شخصیت اور فنکار کی ذات کو وسیلہ بنایا ہے اور اس کی تحلیلِ نفسی کے ذریعے ان شعوری محرّکات تک رسائی کی کوشش کی جو شخصیت کے تال میل سے فن پارے کے دروں میں سرایت کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید کا ایک اہم زاویہ یہ ہے کہ:

> ''انھوں نے ہر جگہ نفسیات کو اپنی ڈھال نہیں بنایا بلکہ تخلیقات کے مزاج کے مطابق جہاں نفسیات کی ضرورت محسوس کی وہاں تخلیق کار اور اس کی تخلیق کو نفسیاتی حوالے سے جانچا ہے لیکن جہاں اس کی ضرورت نہیں تھی وہاں عمرانی اور دیگر دبستان تنقید سے

* شعبہ اُردو، ایجوکیشن یونیورسٹی، لاہور۔
** شعبہ اُردو، ایجوکیشن یونیورسٹی، لاہور۔

بھی استفادے کی راہیں نکالی ہیں اور اس میں انھوں نے ترقی پسندانہ نکتہ نظر اختیار کیا ہے۔''(۱)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈاکٹر سلیم اختر ایک نفسیاتی نقاد ہوتے ہوئے بھی مکمل طور پر نفسیات کو اپنی تنقید کا آلہ نہیں بناتے بلکہ وہ اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ نقاد کو کسی ایک دائرے میں رہ کر کام نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے دائرۂ تنقید کو وسعت دے کر دیگر سماجی علوم کو بھی اپنی تنقید میں شامل کرنا چاہیے کیونکہ یہی وہ صورت ہے جس میں وہ اپنے عہد کے تخلیق کاروں کی فکری وفنی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے۔ انھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''نفسیات میرے لیے اضافی ہے، مطلق نہیں۔ اِسی لیے میں نے افسانوں یا تنقید میں نفسیات کو کبھی بھی اندھے کی لاٹھی نہ بنایا۔''(۲)

اس حوالے سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر سلیم اختر کے بے شمار ایسے تنقیدی مضامین ہیں جن میں نفسیات کو وسیلہ نہیں بنایا گیا بلکہ یہ غیر نفسیاتی مضامین ان کی ذاتی سوچ کے مظہر ہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے کہ:

''اصل اہمیت سوچ کی ہے، اس وسیلہ کی نہیں جس کے ذریعے سوچ کو تقویت دی گئی۔''(۳)

اِسی سوچ کے تحت انھوں نے ''تنقیدی دبستان'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اُردو تنقید کے وسیع دائرۂ عمل میں آنے والے مختلف تنقیدی نظریات کے تحت آنے والے مختلف دبستانوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تنقید کے نو بہ نو رنگوں کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر یوں رقمطراز ہیں:

''تخلیق ہو یا تنقید ___ تصوّراتِ نو کے چراغ فروزاں ہوتے رہتے ہیں، ساتھ ہی کچھ چراغوں کی لَو مدھم پڑ جاتی ہے، کچھ بجھ جاتے ہیں تو کچھ بجھنے کے بعد دُھواں دیتے رہتے ہیں۔ یہی زندگی کا چلن ہے جسے علامہ اقبال ''آئینِ نو'' قرار دیتے ہیں۔ مگر تخلیق اور تنقید میں ''آئینِ نو'' اور ''طرزِ کہن'' کی صورت میں واضح اور دوٹوک قسم کا تضاد نہیں ملتا کہ قدیم کے بطن سے جدید جنم لیتا ہے، جس طرح کسی ستارہ کے مردہ ہو جانے کے باوجود فضائے بسیط میں اس کی روشنی کا سفر جاری رہتا ہے اسی طرح نظریہ، تصور، خیال وغیرہ مردہ ہو کر بھی اپنی اثر اندازی کی صورت میں زندہ رہتے ہیں۔''(۴)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈاکٹر سلیم اختر کسی جامد نظریے کے قائل نہیں اور نہ ہی تنقید کے لیے کسی ایک نظریے کو کافی سمجھتے ہیں بلکہ وہ تحرّک پذیری پر یقین رکھتے ہیں اور بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں نئے نظریات کے اخذ وقبول کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تنقید کے تمام نظریات اور ان کی بنیاد پر وجود پانے والے دبستان کسی نہ کسی سطح پر پہنچ کر ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کے سب غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں

اوران کی اساس ایک ہے۔ لکھتے ہیں:

''مختلف تنقیدی دبستان اپنی مستحکم نظریاتی اساس اور انفرادیت کے باوجود کسی ایک شمس کی کشش کے اسیر سیارگان کی مانند گردش کناں نظر آتے ہیں۔ اپنی انفرادیت، آزادی اور خودکاری کے باوجود بھی۔''(۵)

گویا ڈاکٹر سلیم اختر کی نفسیاتی تنقید بھی دیگر سماجی علوم سے ایک خاص ربط اور تعلق رکھتی ہے۔ مثلاً کسی شاعر یا تخلیق کار کا نفسیاتی مطالعہ اس کے ماحول، حالات زندگی اور اسے درپیش معاشرتی و معاشی مسائل کو جانے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتا اور اس کے لیے تنقید کے عمرانی اور مارکسی دبستان سے رجوع ضروری ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی اپنی تنقید میں اس حربے کو آزمایا ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے تنقید میں نفسیات کو اندھے کی لاٹھی کی طرح استعمال نہیں کیا بلکہ جہاں اس کی ضرورت محسوس کی ہے وہاں اسے استعمال کیا ہے اور جہاں اس کی ضرورت محسوس نہیں کی وہاں عمرانی دبستان سے استفادے کی صورت نکالی ہے۔ اسی بات سے ڈاکٹر سلیم اختر کے سماجی شعور کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ سماجی شعور دراصل اس ادراک کا نام ہے جو ایک نقاد کو بصیرت اور دانائی کی اُس سطح پر پہنچا دیتا ہے جہاں اُسے معاشرتی یا عمرانی ہیئت سے منسلک چیزیں اپنی واضح شکل میں نظر آنے لگتی ہیں اور وہ حالات اور اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق اپنے طرزِ تنقید میں تبدیلی لاتا ہے اور ان چیزوں کی تعبیر و تشریح کرتا ہے۔ کسی ایک نظریے کا پابند رہنے والا نقاد تنقید کے ایک محدود دائرہ عمل پر قناعت کر لیتا ہے اور وہ ہر چیز کو اپنے نظریے کی مخصوص عینک سے دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے اور یوں وہ مشاہدے کی ہمہ گیری اور تجربے کی وسعت سے محروم ہوتا ہے۔ اُس سماجی شعور کے ادراک انجذاب سے بھی محروم ہو جاتا ہے جو اس کی تنقید میں مرکزے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے ''تنقیدی دبستان'' میں تنقید کے حدود اور امکانات، اقسام اور اسالیب متعین کرنے کے بعد اس کے متنوّع دبستانوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان میں تشریحی، سائنٹیفک، تقابلی، رومانی، جمالیاتی، تاثراتی، تاریخی، عمرانی، نفسیاتی، مارکسی، ہیئتی، اسلوبیاتی اور ساختیاتی وغیرہ تنقیدی دبستان شامل ہیں۔ تنقید کی اقسام اور اسالیب کے ذیل میں نظری اور عملی تنقید سمیت قانون ساز، نظریاتی، تشریحی، اکتشافی، مکتبی، تمدنی اور نسوانی تنقید کا مطالعہ انھوں نے سماجی شعور کے آئینے میں کیا ہے۔ اور اس حقیقت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ کوئی فن پارہ یا تخلیق کار کی شخصیت اپنی معاشرت یا عہد سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی۔ چناں چہ جہاں تخلیق کار کی نفسیاتی تحلیل کی ضرورت ہوتی ہے وہاں بھی اُسے اس کے ماحول کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ماحول اس کی شخصیت پر اثر انداز ہو کر کس طرح اس کے مزاج، میلان اور طبع کا تعین کرتا ہے۔ ماحول کے نتیجے میں اس کے ذہن پر کیا اثرات

مرتب ہوتے ہیں؟ اور وہ کس طرح ان اثرات سے متاثر ہو کر اپنی تخلیقات کا رُخ قائم کرتا ہے۔ معاشرہ جب عدم توازن کا شکار ہوتا ہے تو ایک تخلیق کار معاشرے کا حسّاس ترین فرد ہونے کے باعث، کس طرح اس عدم توازن کی زد میں آ کر شخصیت کی شکست و ریخت کا شکار ہوتا ہے۔ وہ کون سے لاشعوری محرّ کات ہیں جو ذات کی شکست و ریخت کے اس عمل کو جواز فراہم کرتے ہیں۔ ایک ادیب یا فن کار معاشرتی ناہمواریوں کے باعث ہی اپنی شخصیت کے نشیب و فراز سے گزرتا ہے۔ چناں چہ اس کی شخصیت کے پست و بلند کا نفسیاتی جائزہ لیتے ہوئے ان معاشرتی ناہمواریوں کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے ادیب اور معاشرے کے اِسی تعلق کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہیری لیون (Harry Levin) کی یہ رائے پیش کی ہے:

> ''ادب اور معاشرہ کا تعلق دوطرفہ ہے، ادب معاشرتی عوامل کا مرہون منت ہی نہیں ہوتا بلکہ بذات خود یہ معاشرتی عوامل کا باعث بھی بنتا ہے۔''(۶)

مولانا حالی نے جو بات لکھی تھی کہ شاعری سوسائٹی کے تابع ہے اُسے ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقیدی بصیرت نے ایک وسیع تر تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے نزدیک فن کار بھرپور تاثر اپنی کلّیت میں اُسی وقت مرتّب ہوتا ہے جب اُسے زندگی کے عام تجربات کے تناظر میں مرتّب کیا جائے اور بقول پروفیسر مسعود حسین خان، فنکار کا ابتدائی تجربہ سماجی زندگی سے شروع ہوتا ہے۔ اس لیے نظریہ شعر مرتّب کرتے وقت ہمیں شاعر یا تخلیق کار کے نظریاتی اور عمرانی حالات پر نظر رکھنی پڑے گی جس کے نتیجے میں ہمیں شاعر کے احوال اور زندگی کو درپیش مسائل سے آگاہی بھی حاصل ہوگی اور اس کی سماجی زندگی کے تجربات بھی آشکار ہوں گے۔ ڈاکٹر سلیم اختر ایک ترقی پسند نقّاد ہونے کے ناطے عمرانی تنقید کو اہمیت دیتے ہیں۔ انھوں نے نفسیات اور عمرانیات کے تال میل سے نہ صرف فنکار کی ذاتی زندگی سے پردہ اٹھایا ہے بلکہ اُس کی شخصیت کے سماجی محرکات تک رسائی کی کوشش بھی کی ہے۔ اُن کا سماجی شعور اس قدر بلند ہے کہ وہ شخصیت پر اثر انداز ہونے والے سماجی عوامل کا بھی تجزیہ کر کے اُس کے نفسیاتی محرکات تلاش کرتے ہیں اس طرح انھوں نے سماج، زندگی، شخصیات اور فن کے روابط کو نہایت باریک بینی سے دریافت کر کے اُن خفیف لغزشوں کی بھی نشان دہی کر دی ہے جو لاشعور، شعور اور سماجی شعور کے اتحاد ثلاثہ میں مضمر ہے۔

اُن کی اکثر تنقیدی کتب زیادہ تر نفسیاتی تنقید کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔ لیکن ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آنے والا ان کے تحقیقی و تنقیدی مقالات کا مجموعہ بہت سے ایسے غیر نفسیاتی مضامین کو پیش کرتا ہے جس میں انھوں نے سراسر معاشرے اور ادب کے حوالے سے اس کے کردار پر بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں مجموعہ میں شامل پیشتر مضامین اس رجحان کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مثلاً ''عالمگیریت اور جدید ادبی رجحانات''، ''بدلتے معاشرے میں ادب کا کر

دار''، ''ادب میں ابلاغ'' وغیرہ خاص طور پر تنقید میں سماجی شعور کے آئینہ دار ہیں۔ اُن کے مضمون ''بدلتے معاشرے میں ادب کا کردار'' سے ایک اقتباس دیکھیے:

> ''معاشرہ مستحکم ہو تو اسے ادب یا کسی بھی چیز سے خطرہ محسوس نہیں ہو سکتا لیکن بے بنیاد معاشرہ، خوفزدہ معاشرہ ہوتا ہے۔ خوف چیزوں کو ان کے حجم سے بڑا دکھا کر خوف میں مزید اضافہ کرتا ہے، اِسی وجہ سے ہمارے ہاں معمولی نوعیت کے علمی مباحث کے نتیجہ میں اسلام خطرہ میں پڑ جاتا ہے، دو قومی نظریہ کی تردید ہو جاتی ہے اور ملک کا مستقبل مخدوش ہو جاتا ہے۔''(۷)

ان سطور سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر معاشرے کے زوال سے کس طرح ادب کا اطلاق کر کے سماجی شعور کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ سماجی شعور یہی نہیں ہے کہ معاشرے کی دھڑکنوں کو محسوس کیا جائے اور اس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کی کیفیتوں کو جانچنے کی سعی کی جائے بلکہ سماجی شعور یہ بھی ہے کہ اس میں تخلیق کیے جانے والے ادب کی نوعیت کو بھی سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یہی سماجی شعور، عصری شعور کی بنیاد بنتا ہے۔ سلیم اختر نے اپنی تنقید میں بطور خاص اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ ادیب اگر معاشرتی جبر کا شکار ہوگا تو اس کا ادب بھی ایک مایوس کن صورتحال کو پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ لیکن اگر ادیب کو اپنے معاشرے میں آزاد تخلیقی فضا میسر ہے تو اس کی تخلیقات میں بھی تازگی اور خوش گواریت کا احساس پیدا ہوگا۔ اس کی تحریروں میں گھٹن کا احساس کم سے کم ہوگا اور ایک تخلیق کار کے ادب پارے کی وسعت نہ صرف کئی دہائیوں پر محیط ہوگی بلکہ وہ عہدِ آئندہ کے امکانات کی خبر بھی دے گا۔ کیونکہ تنقید نگار کسی بھی تخلیق کا جائزہ لیتے ہوئے اس بنیادی بات سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا کہ ایک ادیب یا تخلیق کار کس نوع کا معاشرتی طرزِ احساس لے کر جادۂ تخلیق پر رواں دواں ہے۔ یہ معاشرتی طرزِ احساس کہیں معاشرتی جبر کی گرفت میں تو نہیں رہا۔ اگر رہا ہے تو اس معاشرتی جبر کی نوعیت کیا ہے؟ اور اگر وہ معاشرتی جبر سے آزاد رہا ہے تو وہ کس مثالی معاشرے کا فرد ہے جہاں اُسے ہر طرح کی ذہنی آزادی میسر ہے کہ وہ بلا خوف و خطر اپنی مرضی اور منشا سے قلم کو حرکت میں لا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اپنی تنقید میں سماجی شعور کے ذیل میں اس صورت حال کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ اُن کا ایک مضمون ''سماجی محرکات کی تلاش۔ عمرانی تنقید'' اس ذیل میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے زیادہ تر اسی امر پر بحث کی ہے کہ تنقید میں جب ہم سماج کو زیر بحث لاتے ہیں تو اُسے ایک کُل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جس میں تہذیبی عناصر اور تمدنی عوامل سبھی شامل ہوتے ہیں۔ کسی سماج کی تشکیل میں انہی تہذیبی اور تمدنی محرّکات کی کارفرمائی ملتی ہے جن کا مطالعہ بجائے خود علم کے نئے آفاق سے روشناس کراتا ہے۔ کسی بھی سماج میں رواج پانے والے مخصوص عقائد، رسوم و رواج اور توہمات و تعصّبات وغیرہ بظاہر

آزاد، خودرَو اور خودکار معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت یہ سب ایک ہی رشتے میں منسلک ہیں اور ان کے پس منظر میں صدیوں کا انسانی شعور موجود ہے۔ نقاد سب سے پہلے ایک مخصوص سماج یا معاشرے سے وابستہ رجحانات کے تجزیے سے ایک خاص عہد کے ذہنی پس منظر کا تعین کرتا ہے۔ اس ذہنی پس منظر اور اس کی تشکیل کرنے والے تمدنی عناصر کا تجزیہ اس بنا پر بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ نقاد نے اس حوالے سے تخلیق کار اور تخلیقات کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ اور اسی حوالے سے عصری شعور کی نشان دہی کرنا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس سلسلے میں دہلی اور لکھنو کے دبستانوں کی مثال دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان دونوں دبستانوں کے مخصوص رجحانات ان میں قطبین کا بُعد پیدا کر دیتے ہیں جب کہ ان کے خصائص کی وجوہات سماجی محرّکات میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ دونوں شہروں میں سیاسی حالات کی وجہ سے طرزِ بود و باش اور اندازِ زیست ایک دوسرے کے برعکس تھا۔ اسی طرح وہ سماجی عوامل بھی اہمیت کے حامل ہیں جنھوں نے لکھنوی سماج کو ایک خاص سانچے میں ڈھال کر اس تہذیب و تمدّن کی بنیاد ڈالی جس نے افراد میں وہ مزاج پیدا کیا جسے ''دہلوی'' سے متمیّز کرتے ہوئے ''لکھنوی'' کہہ سکتے ہیں۔ یوں جب اس عہد کے ذہن کو مخصوص سانچہ میں ڈھالنے والے عناصر کی تفہیم ہو جائے تو پھر ان کی روشنی میں تخلیقات کا جائزہ لے کر اس امر کا تعین کرنا ہوگا کہ ان سماجی عناصر نے تخلیقات میں کہاں تک فروغ پایا۔''**(۸)**

ڈاکٹر سلیم اختر کے اس نقطہ نظر سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کسی ادب پارے کو وجود میں لانے والے سماجی محرکات تخلیق کار کے ذہن میں سماجی شعور بھی پیدا کرتے ہیں۔ ایک مخصوص عہد میں پیدا ہونے والا سماجی شعور ہی دراصل عصری حوالے سے عصری شعور کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے خیال میں سماجی شعور ہی دراصل عصری شعور کو وجود میں لانے کا باعث بنتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے تنقیدی و تحقیقی مقالات کے مجموعہ میں ''میزان'' کے عنوان کے تحت چار مضامین شامل ہیں۔ ان چاروں مضامن کے عناوین ناموں کے معمولی فرق سے ایک جیسے ہیں مثلاً ''کیا آج غالب کی ضرورت ہے؟''، ''کیا آج سرسید احمد خاں کی ضرورت ہے؟''، ''کیا آج حالی کی ضرورت ہے؟''، اور ''کیا آج جوش ملیح آبادی کی ضرورت ہے؟'' یہ چاروں عناوین ایک مخصوص عہد کے تقاضوں سے تعلق رکھتے ہیں اور تنقید نگار کے اس عصری شعور کے آئینہ دار ہیں جس کے تحت وہ اپنے عصر اور عہد میں غالبؔ، سرسید، حالیؔ یا جوشؔ کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا عصری شعور انھیں اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ عصرِ حاضر میں وسیع المشرب، موحّد، ترک رسوم کرنے والے حیوانِ ظریف، زندگی اور موت کی دوئی کا احساس مٹانے والے شاعر، غم، دکھ اور پریشانیوں کی تلخی کم کرنے والے صاحبِ فہم، صاحبِ نظر اور صاحبِ دل دانش ور شاعر کی اس لیے ضرورت ہے کہ عصرِ حاضر میں یہی

جنس نایاب ہے۔ اسی لیے آج کا دور اپنے غالب کی تلاش میں ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے ایک نقّاد کی حیثیت میں اپنے عہد کی ضرورت کا احساس پیدا کر کے آج کے دور میں غالبؔ کی موجودگی کا جواز پیدا کیا ہے۔ سرسید کی آج کے دور میں کتنی ضرورت ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''گماں آباد ہستی میں آج ہماری قوم یقین اور تشکیک کے دوراہے پر سرگرداں ہے، سر سید اور علامہ اقبال نے قوم میں نفاق پیدا کرنے والے جن امور سے بچنے کی تلقین کی تھی وہ آج سب عفریت کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ مذہبی تعصّب نے جنون کی صورت اختیار کر لی ہے۔ سیاسی اور مذہبی دہشت گردی سکہ رائج الوقت ہے۔ سیاسی قائدین قول و فعل میں تضادات کے ماہر، سیاسی وفاداریوں کا جمعہ بازار گرم، اہل علم خوار اور اہلِ زر برسرِ کار، درس گاہ میں استاد بہت تعلیم مفقود، ڈگریاں حاضر مگر اہلِ علم عنقا، دانش ور ہیں مگر دانش نہیں، شاعر استعارہ فروش ہیں تو اہل قلم لفظ کی حُرمت کے سوداگر..... ایسے میں جب سب آزمائے جا چکے ہیں تو ہمیں پھر کسی سرسید کی تلاش ہے، عہدِ انتشار اور دورِ منافقت اپنے سرسید احمد خاں کی تلاش میں ہے۔''(۹)

اس طرح ڈاکٹر سلیم اختر کو آج کے عہد میں حالی کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ:

''آج اُردو تنقید بے وزنی کے عالم میں ہے۔ ہمارے پاس اس وقت کوئی اتنی بڑی ادبی تھیوری نہیں ہے جو تنقید کی ڈانواں ڈول نیا کے لیے لنگر کا کام کر سکے۔ اسی لیے آج پانی پت کے الطاف حسین حالی کی ڈیڑھ صدی بعد پہلے سے بھی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آج کا عہد اپنے حالی کی تلاش میں ہے۔''(۱۰)

ڈاکٹر سلیم اختر عصرِ رواں میں جوش کی ضرورت بھی محسوس کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''نکاتِ سخن سمجھانے کے لیے نہیں، حُسنِ زبان کے قرینے سکھانے کے لیے نہیں، پُر جوش شاعری اور نظمیں سنانے کے لیے بھی نہیں بلکہ عصری صورتِ حال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قدم کے مجرموں کی طرف الزام دیتی انگلی اٹھانے کی جرأت پیدا کرنے کے لیے۔ کالے آقاؤں، جاگیرداروں، وڈیروں، حاکموں اور ملاؤں کے خلاف لب کشائی کی ہمت پیدا کرنے کے لیے۔''(۱۱)

ڈاکٹر سلیم اختر موجودہ دور میں ادب اور ادبی تحریکات کا بھی گہری نظر سے تجزیہ کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

''آج ادبی منظر نامہ کا جائزہ لینے پر یہ واضح ہوتا ہے کہ اس وقت یہاں کوئی بھی ادبی تحریک موجود نہیں، ادب برائے ادب، ادب برائے اسلام، پاکستانی ادب، علامت

نگاری، تجریدیت وغیرہ نے نعروں کی صورت اختیار کی، لیکن کچھ دیر کے لیے.....ترقی پسندی کو ایک تحریک کے روپ میں نہیں بلکہ ایک زاویہ نگاہ کی صورت میں زندہ رکھنا ہوگا۔ مخالفتوں کے گزشتہ بیس برس بھی اسی وجہ سے گزر گئے تھے کہ جن لوگوں نے اسے سوچ کا ایک زاویہ سمجھا، انھوں نے بدلے حالات کے باوجود بھی اس زاویہ میں تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ لوگ اب بھی موجود ہیں اور پہلے کی طرح اب بھی نئے اذہان کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔''(۱۲)

عصری صورت حال کو سمجھ کر اس کے تقاضوں پر کان دھرنے کا نام عصری شعور ہے تو ڈاکٹر سلیم اختر نے ایک نقّاد کی حیثیت سے گہرے طور پر اس کا ادراک کیا ہے۔ اُن کی تنقید سراسر اپنے عہد کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک نفسیاتی نقّاد کے طور پر معروف ہیں لیکن انھوں نے ترقی پسند ہونے کے ناطے اپنے عہد کی سماجیات سے گہرا رابطہ رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے معاشرے اور سماج کا بھی نفسیاتی مطالعہ کیا ہے اور یوں سماجی نفسیات کا ڈول ڈالا ہے۔ نفسیاتی شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ گہرا سماجی شعور بھی رکھتے ہیں جس کی اساس عصری شعور پر ہے۔ یعنی اپنے عصر، عہد اور زمانے کی مرئی اور غیر مرئی کیفیتوں کو جاننا اور اس پر گزرنے والی ساعتوں کو شمار کر کے تخلیقی عمل کا حساب لگانا۔ ڈاکٹر سلیم اختر سے بہتر اس ساعت شماری اور تنقید نگاری کے عمل کو کون جانتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عاصمہ اصغر، ڈاکٹر، ''مکالماتِ سلیم''، اظہار سنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۸

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، مجموعہ ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۶، ۷

۳۔ ایضاً، ص ۶

۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''تنقیدی دبستان''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۸، ۹

۵۔ ایضاً، ص ۹

۶۔ ایضاً، ص ۱۴۳

۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، مجموعہ ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۴۱

۸۔ ایضاً، ص ۴۲۷، ۴۲۸

۹۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۱۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ترقی پسندی کیا نہیں؟، مشمولہ: ادب اور کلچر، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۴ء، ص ۱۸۱